حضرت امیرالمومنین افریقن مبلغوں اور احمدیوں کے درمیان

احمدیان افریقہ

مدرسہ احمدیہ افریقہ

کہ ساری مجلس پر ایک سناٹا چھا گیا۔ سکتہ کا عالم اور خاموشی طاری ہو گئی۔ آخر شیخ رحمت اللہ صاحب نے سکوت کو توڑا۔ اور کھڑے ہو کر ٹھیٹھ پنجابی زبان میں جو کچھ فرمایا۔ اس کا خلاصہ مطلب اردو میں یہ ہے۔ کہ:۔

"میں نے قادیان آتے ہوئے راستہ میں
بھی بار بار یہی کہا ہے۔ اور اب بھی ابھی
کود پھر رہا ہوں۔ کہ اس بڈھے کو آگے کرو
اس کے سوا یہ جماعت قائم نہ رہ سکیگی"

شیخ صاحب کے اس بیان پر خاموش رہ کر گویا سبھی نے مہر تصدیق ثبت کی۔ اور سر تسلیم خم کر دیا۔ کسی نے اعتراض کیا نہ انکار۔ اس اتفاق کے بعد انہی اصحاب مع دیگر اکابر صحابہ و بزرگان جماعت سیدنا نور الدین اعظم رضی اللہ عنہ کے حضور درخواست کی۔ جو باغ سے شہر تشریف لائے ہوئے تھے۔ مگر حضرت ممدوح نے کچھ سوچ اور تردد کے بعد فرمایا۔ کہ میں دعا کے بعد جواب دوں گا۔ چنانچہ وہیں پانی منگایا گیا۔ حضرت نے وضو کر کے دو نفل نماز ادا کی۔ اور دعاؤں کے بعد فارغ ہو کر فرمایا:۔

"چلو ہم سب وہیں چلیں جہاں ہمارے
آقا کا جسد اطہر اور ہمارے بھائی
انتظار میں ہیں"

چنانچہ یہ مجلس برخواست ہو کر پھر باغ پہنچی۔ جہاں امر خلافت کے متعلق موجودہ جماعت کے تمام مردوں اور عورتوں کو اللہ تعالےٰ نے انشراح بخش کر خلافت حقہ پر متفق و متحد کر کے سلک وحدت میں پرو دیا۔ اور اس طرح خدا کے فضل سے خلافت قائم ہوئی۔ اور مطابق الوصیت قائم ہوئی۔ کوئی اختلاف ہوا نہ انکار۔ خدا نے اپنے سلسلہ کو خود سنبھالا اور

نبی اللہ المسیح الموعود

علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی وفات پر جماعت کو حق و صداقت اور سداد و راستی پر قائم کر کے اپنی سنت قدیم کا ظہور فرما دیا:

مگر آپ تعجب کریں گے۔ حیرت و استعجاب اور تردد میں پڑ جائیں گے۔ جب مذکورہ بالا واقعات کے چھٹے ہی روز بعد وقوع پذیر ہونے والے تغیر کا ذکر آپ کے سامنے آئیگا۔ آپ تاسف کریں گے۔ اور کف افسوس ملنے لگیں گے۔ کیونکہ بات ہی کچھ ایسی ہے۔ کہ اس پر جتنا بھی اظہار حیرت و استعجاب کیا جائے کم ہے۔

واقعہ یوں ہے۔ کہ قدرت ثانیہ کے قیام کے چھٹے روز ہمارے کرتے دھرتے اور اصحاب حل و عقد پھر قادیان تشریف لائے۔ حضرت مولانا مولوی سید محمد سرور شاہ صاحب بیان فرماتے ہیں۔ کہ شہر سے سیدنا حضرت محمود ایدہ اللہ تعالےٰ کو اور مولوی محمد علی صاحب اور بعض اور اپنے ہم خیال آدمیوں کو انہوں نے ساتھ لیا۔ اور

مزار سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود

علیہ الصلوٰۃ والسلام

پر جا کر دعا کی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد شہر کو لوٹے۔ مگر باغ کے شمال مشرقی کونہ پر پہنچکر خواجہ صاحب نے مغربی جانب باغ کی طرف رُخ کر لیا۔ اور ادھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ ٹہلتے ٹہلتے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز کو خطاب کر کے بولے:۔

"میاں ہم سے ایک غلطی ہو گئی ہے
جس کا تدارک اب سوائے اس کے
کچھ نظر نہیں آتا۔ کہ ہم کسی ڈھنگ سے
خلیفہ کے اختیارات کو محدود کر دیں۔
وہ بیعت لے لیا کریں۔ نماز پڑھا دیا کریں
خطبہ نکاح پڑھکر ایجاب و قبول اور
اعلان نکاح فرما دیا کریں یا جنازہ پڑھ
دیا کریں۔ بس"

خواجہ صاحب کی بات حضرت محمود ایدہ اللہ تعالےٰ نے سنی۔ اور جواب میں فرمایا:۔

"خواجہ صاحب ہم کون ہیں۔ جو خلیفہ کے اختیارات کی تقسیم کریں؟ خلیفہ بن جانے کے بعد وہ حاکم ہیں نہ کہ ہم۔ ان باتوں کا وقت وہ تھا۔ جب آپ لوگ میرے پاس آئے تھے اور خلافت کے متعلق مجھ سے مشورہ طلب کیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے آپ سے کہا تھا۔ کہ اوّل تو میری عمر ہی ایسے اہم امور میں کوئی مشورہ دینے کے لائق نہیں۔ دوسرے اس وقت میرا دماغ بھی اس صدمہ عظیمہ کی کی وجہ سے کام نہیں کرتا۔ مگر باوجود اسکے میں اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس معاملہ کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جب بیعت کر لی۔ اور ہم بک گئے۔ تو پھر سوائے اس کے کہ ہم ہر رنگ میں ان کی اطاعت کریں چارہ نہ ہوگا۔ مگر آپ لوگوں نے اس وقت اس بات پر اصرار کیا۔ کہ خلیفہ ضرور ہونا چاہیئے۔ خلیفہ کے بغیر جماعت کا شیرازہ قائم نہ رہ سکے گا۔ آخر اس پر اتفاق ہو گیا۔ اور ہم سب نے برضا و رغبت ایک شخص کی بیعت کر لی۔ اور اس کے ہاتھ پر بک چکے۔ تو اب ہم کون ہیں جو اس کے اختیارات میں دخل دیں۔ یا اُن کو محدود کریں؟"

یہ جواب حضرت فضل عمر رضؓ کا خواجہ صاحب نے سنا اور خاموش رہ گئے۔ انہوں نے کسی امید پر یہ بات بڑی حکمت اور موقعہ شناسی سے شروع کی تھی۔ مگر حضرت محمود کے جواب نے اُن کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اُن کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ اور آخر وہ چہل قدمی بھول کر ساتھیوں سمیت شہر میں آ گئے سیدنا محمود الگ اندر تشریف لے گئے۔ اور خواجہ صاحب وغیرہ اصحاب مولوی محمد علی صاحب والے کمرہ مسجد میں داخل ہوئے۔ تو خواجہ صاحب مولوی محمد علی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھکر بولے:۔

"مولوی صاحب! میاں سے تو ناامید ہو جاؤ۔
وہ تو اب ہمارے ہاتھ سے گیا"

القصہ چھٹے روز بعد یہ لوگ اپنے کئے پر پشیمان ہوئے اور خلافت کے خلاف کوششیں شروع کر دیں۔ اور کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثاً والی مثال ان پر صادق آنے لگی۔ حضرت محمود ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز کو گانٹھنے کا منصوبہ ناکام رہا۔ ہوتے ہوتے وقت گذرتا گیا۔ اور آخر کار جلسہ سالانہ ۱۹۰۸ء پر تو وہ لوگ کھل کھیلے۔ اور اس کے بعد ان لوگوں نے ایک لمبی چوڑی سوچ بچار اور صلاح مشورہ کے بعد کچھ اور حیلے شروع کئے۔ جن کے نتیجہ میں خواجہ صاحب نے ایک پروگرام مرتب کیا۔ جس کا ماحصل یہ تھا۔ کہ:۔ خواجہ صاحب خود تو باہر نکلیں اور دورہ کر کے بیرونی جماعتوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا کر لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائیں۔ پروپیگنڈا کریں۔ اور قادیان میں مولوی صدر الدین صاحب اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر یہاں مقامی لوگوں میں وہ اپنے خیالات کی اشاعت کر کے انہیں اپنے رنگ میں رنگین کرتے رہیں۔ وہاں باہر سے آنے والے مہمانوں سے میل ملاقات اور راہ و رسم بڑھائیں اُن کی آؤ بھگت اور خاطر مدارات کے ذریعے اُن کے دلوں میں اپنے اور اپنے خیالات کے لئے جگہ بنائیں۔ اس کے علاوہ ایک تجویز یہ بھی کی گئی۔ کہ بیرونی جماعتوں کے خاص خاص آدمی بلوا کر ایک دعوت کر کے ان پر اثر ڈالا جائے۔ وغیرہ۔ چنانچہ خواجہ صاحب اپنے پروگرام کے ماتحت شہر بشہر دورہ کر کے لیکچر دیتے اور اپنے خیالات کی اشاعت کیا کرتے۔ تو جناب مولانا مولوی صدر الدین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی مرکز میں رہ کر اپنا کام عقلمندی و ہوشیاری سے کرتے رہے۔ حتیٰ کہ چند ماہ کی متواتر سعی و کوشش سے ان کو یقین ہو گیا۔ کہ جس مقصد کے لئے وہ کھڑے ہوئے تھے۔ اس میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جماعت کے لوگ اُن کا ساتھ دیں گے۔ اور اس طرح وہ

جماعت سے جو کچھ چاہیں گے منوالیں گے

چنانچہ ۱۹۰۹ء کے شروع میں ان لوگوں نے بڑی تیاریوں کے بعد لمبے چوڑے منصوبے گانٹھ کر اپنے ہم خیال لوگوں کو لے کر قادیان پر ہلا بول دیا۔ مسئلہ بڑا زیر بحث یہی تھا۔ کہ

انجمن حاکم یا خلیفہ؟

ان لوگوں کی تگ و دو اور دوڑ دھوپ کی اطلاعات مرکز میں بھی پہنچا کرتیں۔ مگر خلیفہ وقت نہایت رحیم و کریم طبیعت کے انسان تھے۔ کسی کی ٹھوکر کا موجب بننے سے بچنے کی انتہائی کوشش فرماتے۔ اور اکثر چشم پوشی سے کام لیا کرتے۔ اور جب تک کوئی بات اپنی حد سے گذر نہ جاتی۔ اس کی طرف چنداں توجہ نہ دیتے۔ مرکز کے سمجھدار لوگ خواجہ صاحب اور ان کے ساتھیوں کی کارروائیوں کو خطرہ کی نظر سے دیکھتے۔ مگر فتنہ کے خوف سے خاموش رہتے۔ لیکن جب بات بہت بڑھ گئی۔ تو خلیفہ وقت نے بھی توجہ فرمائی۔ اور آخر مجبور ہو کر آپ نے اس قسم کے سوالات کو بعض اصحاب الرائے کے پاس جواب کے لئے بھیجدیا۔

جماعت مرکزیہ نے بھی حتی الوسع اپنا فرض ادا کیا۔ لاہور کے جلسہ کی روئداد معلوم ہونے پر ایک جلسہ کر کے خلافت سے وابستگی اور مقام خلافت کی عظمت اور اس کے واجب الاطاعت ہونے کے متعلق تقاریر کر کے ریزولیشن پاس کیا۔ یہ جلسہ حضرت عرفانی صاحب کی تحریک پر انہی کے مکان کے بالاخانہ پر ہوا۔ جس میں بیالیس ۴۲ اصحاب شریک ہوئے۔ جن میں سے صرف دو نے اختلاف کیا۔ اور باقی تمام متفق تھے۔ ۳۱ جنوری ۱۹۰۹ء کی تاریخ اس قضیہ کے فیصلہ کا دن مقرر تھا۔ صبح کی نماز حسب معمول حضرت نور الدین اعظم رضؓ خلیفہ وقت نے مسجد مبارک میں پڑھائی۔ جو پیش آنے والے تاثرات کے ماتحت خاص ہی نماز تھی۔ حضرت نے سورۃ البروج تلاوت فرمائی۔ اور اگرچہ آج کی نماز شروع سے لیکر آخر تک ساری ہی سوز و گداز۔ عجز و نیاز۔ گریہ و بکا۔ اور تضرع اور خشوع خضوع کا مجموعہ تھی۔ مگر جب آپ آیت قرآنی ان الذین فتنوا المؤمنین والمؤمنٰت ثم لم یتوبوا فلھم عذاب جھنم ولھم عذاب الحریق پر پہنچے۔ تو آپ کی آواز بھی نہ صرف یہ کہ درد و کرب سے بھرائی ہوئی نکلتی تھی۔ بلکہ چیخیں نکل جاتی تھیں آپ نے اس آیت کو دوہرایا اور پھر تیسری بار پڑھا۔ وہ سماں آج بھی یاد آ کر دل کو پگھلا دیتا اور رنج کلوگیر بن جاتا ہے۔ مسجد آہ و نالہ اور فغاں سے گویا ماتم کدہ بن رہی تھی لوگ بلبلا بلبلا کر سسکیاں لیتے اور دعائیں کرتے تھے۔ سجدہ گاہیں آنکھ کے پانی سے تر اور روتے روتے لوگوں کی گھگھیاں بندھ گئی تھیں۔ نماز اپنی کیفیت کے لحاظ سے خاص ہی نماز تھی۔ جو کہ شاذ ہی کبھی اللہ کے فضل سے میسر آیا کرتی ہیں۔

پھر مسجد مبارک کی چھت پر ہوا جو کچھ ہوا۔ سیدنا خلیفۃ المسیح اول رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ کہتے ہوئے کہ

"میں تمہاری بنائی ہوئی مسجد میں کھڑا بھی نہیں ہوتا"

حضرت مولانا مولوی عبد الکریم صاحب مرحوم مغفور والے کمرہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے ہوئے تھے۔ اُس نقشہ کو دیکھنے۔ حالات کو جاننے اور حضرت ممدوح کی تقریر کے سننے والے خدا کے فضل سے ابھی بہت وجود موجود ہیں۔ جبکہ آخر تائب ہو کر اُن خیالات کو ترک کرنے کے عہد پر دوبارہ بیعت توبہ کرنی پڑی۔

یہ درست ہے۔ کہ محترم حضرت میر محمد اسحاق صاحب نے وہ چند سوالات حل اور صاف کرانے کی غرض سے لکھکر حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے پیش کئے تھے۔ مگر وہ سوال پیدا انہیں اکابر کے کئے ہوئے تھے۔ جو عموماً اپنی مجالس اور نشستوں میں اپنے جلسوں اور وعظوں میں۔ بلکہ تقریروں اور تحریروں میں دوہراتے اور سجا سجا کر لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اور جنہوں نے اس سے چند روز قبل سالانہ جلسہ کے موقعہ پر اپنی تقریرات کو انہی باغیانہ خیالات کی اشاعت کا ذریعہ اور آلہ بنایا تھا۔ حضرت مولانا مولوی سید محمد سرور شاہ صاحب بیان فرماتے ہیں کہ وہ ان ایام میں محمود ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز کو پڑھانے کے لئے حضور کے مکان پر جایا کرتے تھے۔ ایک دن صبح جو آپ حضرت کے بالاخانہ پر تشریف لے گئے۔ تو سیدنا حضرت محمود ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز نے سبق شروع کرنے سے قبل حسب ذیل رؤیا سنایا:۔

"میں نے دیکھا۔ کہ بالکل نیا ایک ہال ہے۔
جو احمدیہ ہال معلوم ہوتا ہے۔ اور ابھی لکڑیوں
کے چھلکے وغیرہ ادھر اُدھر پھیلے پڑے ہیں
ہال مکمل ہو چکا ہے۔ بارہ۔ چودہ یا سولہ
شہتیر اس کی چھت کے ہیں۔ اتنے میں
ہمارے ماموں میر محمد اسحاق صاحب کھیلتے
کودتے اس ہال میں آ نکلے۔ ان کے ہاتھ میں
دیا سلائی ہے۔ جو انہوں نے رگڑ کر جلائی
اور لکڑی کے خشک چھلکوں کو دکھا دی۔ جو
ادھر اُدھر فرش پر پھیلے پڑے تھے۔"

فرمایا:۔

"میں نے دیکھا۔ کہ آگ بھڑک کر شعلے بلند ہوئے۔
اور چھت کے شہتیروں میں سے بعض شہتیر
جل کر راکھ ہو گئے ہیں"

مولوی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ خواب سن کر میں نے عرض کیا کہ

"اس کی تعبیر تو ظاہر ہو چکی۔ وہ آگ لگ
چکی ہے۔ اس پر حضرت نے دریافت فرمایا۔
وہ کیسے؟"

مولوی صاحب فرماتے ہیں:۔

"تب میں نے عرض کیا۔ کہ میر محمد اسحاق صاحب نے بعض سوالات لکھکر حضرت خلیفہ اوّل

رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو دیدئے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ یہی وہ آگ ہے۔ جس کے نتیجہ میں بعض شہتیروں کا جل جانا لازمی ہے"

حضرت مولوی صاحب بیان فرماتے ہیں۔ کہ میرے اس بیان سے صاحبزادہ والاتبار کو سخت صدمہ ہُوا۔ جس کی وجہ سے آپ نے کتاب جو پڑھنے کے لئے کھولی ہُوئی تھی بند کردی۔ اور اس رنج وغم میں پھر کچھ نہ پڑھا۔

حضرت کی اس رؤیا کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے۔ کہ:۔

"جب میر محمد اسحٰق صاحب نے دیا سلائی سلگائی۔ تو حضرت نے اُن کو روکا کہ چھپکوں میں نہ لگانا۔ مگر میر صاحب نے باوجود منع کرنے کے آگ لگا ہی دی"

الغرض ہمارے ان غلطی خوردہ بھائیوں نے خلافت کا اقرار کرنے کے بعد انکار۔ بیعت کر لینے کے بعد بغاوت اور سرکشی اختیار کی۔ مگر خدا کا شکر ہے۔ اس انکار پر اصرار نہ کیا۔ آخر جلد ہی نادم و تائب ہُوئے۔ اور از سرِ نو بیعت کر کے پھر سے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ پر عمل پیرا ہو کر نیک، پاک احمدی بن گئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی رحمدلی اور شفقت وکرم ملاحظہ ہو۔ کہ ان واقعات کے ذکر کو حکماً روک دیا۔ اور فرمایا۔ کہ متعلقہ کاغذات تک۔ جلا دیئے جائیں۔ اخبارات میں بھی اس وقت کوئی ذکر نہ ہُوا۔ غرض آپ کی نیت محض اصلاح تھی نہ کسی کا خوف و ڈر۔ ڈرنے کے وقت نہ ڈرے۔ خوف کے وقت انہوں نے کسی بڑے سے بڑے کی پرواہ نہ کی۔ اور حق بات کے اظہار سے نہ رُکے۔ تو بعد میں کس بات کا خوف اور کس چیز کا ڈر تھا، جو آپ نے چشم پوشی فرمائی۔ تو اس خیال سے کہ آپ کسی بدنصیب کی ٹھوکر کا موجب نہ بنیں۔ شاید یہ لوگ اصلاح کر کے خدا کے غضب کی آگ سے بچ جائیں۔ مگر

تہیدستانِ قسمت را چہ سُود از رہبرِ کامل

یہ ندامت و پریشانی۔ یہ رجوع و حیرانی اور توبہ و بیعت صرف مسجد کی چھت تک ہی محدود تھی۔ موقعہ کے گواہ اور شاہد ناطق موجود ہیں۔ کہ سیڑھیوں سے اترتے ہی جو کچھ سنا گیا۔ وہ یہ تھا۔ کہ:۔

"خواجہ صاحب! آپ نے بہت ذلیل کرایا۔ جب ایک بات ہو چکی تھی۔ تو صبر اور حوصلہ سے اس کو برداشت کرنا چاہیئے تھا۔ ایک سوتے فتنہ کو جگا کر آپ نے اس حال کو پہنچایا۔ میری غیرت اور حمیت کا تو اب یہی تقاضا ہے۔ کہ میں اس جگہ کو خیر باد کہکر کسی گوشۂ تنہائی وخلوت میں جا رہوں۔ ذلت کی انتہا ہو چکی۔ جو کم از کم میری برداشت سے تو باہر ہے۔ وغیرہ"

چنانچہ خواجہ صاحب کو اس مشکل کے حل۔ رفیق کے جوش کو ٹھنڈا کرنے اور اس کی طبیعت کو سنبھالنے اور سلجھانے کی غرض سے دو تین روز مجبوراً قیام کرنا اور خدا جانے کیا کیا کچھ کہنا۔ سننا اور کرنا پڑا تھا۔ جس کے نتیجہ میں جناب مولوی محمد علی صاحب نے اپنا وہ فیصلہ اور عزم منسوخ کیا۔ اور سردست قادیان میں ٹھیرے رہنے پر رضامند ہو گئے تھے۔

یہ کہانیاں بہت لمبی۔ قصے طویل اور واقعات بہت ہی پیچیدہ ہیں۔ ان کو چھوڑتا اور مختصر کرتا ہُوا اب صرف اس قضیۂ نامرضیہ کی طرف اشارہ کر کے آگے چلتا ہوں۔ جو

فتنۂ حویلی کا شاخسانہ

تھا۔ اور جس میں ان اکابر اور طالبان حکومت و اختیار نے اپنے ایمان و اخلاص۔ تقویٰ و پرہیزگاری اور توبہ و رجوع کے وہ نمونے دکھائے جن کے ذکر سے بھی کلیجہ منہ کو آتا اور سر مارے ندامت و شرمندگی کے جھکا جاتا ہے۔ وہی جو ۲۷ مئی ۱۹۰۸ء کو بہزار منت اور لجاجت بالکل بے غرض ایک ہستی سے التجا و درخواست کر رہے تھے۔ کہ خدارا قوم کی باگ ڈور تھامیئے۔ جماعت کو سنبھالئے۔ اور راہ نمائی فرمایئے۔ وہ انکار کرتا اور بار بار کہتا تھا۔ کہ:۔

"میں کبھی امام بننے کا خواہشمند نہیں ہُوا۔ یہ ایک بڑا بوجھ ہے خطرناک بوجھ ہے۔ اس کا اٹھانا مامور کا کام ہو سکتا ہے۔ میں اپنے میں اس بوجھ کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ لیکن جب کہ بلا میری خواہش کے یہ بار میرے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔ اور دوست مجھے مجبور کرتے ہیں۔ تو

اس کو خدا کی طرف سے سمجھکر میں قبول کرتا ہوں۔

میں خود ضعیف ہوں۔ بیمار رہتا ہوں۔ پھر طبیعت مناسب نہیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ جن عمائد کا نام لیا ہے۔ اُن میں سے کوئی منتخب کر لو۔ میں تمہارے ساتھ بیعت کرنے کو تیار ہوں۔ اگر تم میری ہی بیعت کرنا چاہتے ہو۔ تو سُن لو۔ کہ بیعت بِک جانے کا نام ہے۔ ایک دفعہ حضرت صاحب نے مجھے اشارۃً فرمایا۔ کہ وطن کا خیال بھی کرنا۔ سو اس کے بعد میری ساری عزت اور سارا خیال انہی سے وابستہ ہو گیا۔ اور میں نے کبھی وطن کا خیال تک نہیں کیا۔ پس بیعت کرنا ایک مشکل امر ہے۔ اب تمہاری طبیعتوں کے رُخ خواہ کسی طرف ہوں۔

تمہیں میرے احکام کی تعمیل کرنی ہوگی۔ اگر یہ بات تمہیں منظور ہو۔ تو میں طوعاً وکرھاً اس بوجھ کو اٹھاتا ہوں۔

ان تمام شرائط کو مان کر قبول کر کے آپ کو خلیفہ برحق اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح واجب الاطاعت مان کر۔ سوچ سمجھ کر بیعت کی تھی۔ مگر جلد ہی سب وعدوں کو بھول گئے۔ اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ وہی جنہوں نے مسجد مبارک کی چھت پر ایک بہت بڑی جماعت کے روبرو پھر

توبہ کر کے بیعت کی

اپنی طبیعتوں پر قابو نہ رکھ سکے۔ نفس ان کے شُتر بے مہار کی طرح بے قابو ہو گئے۔ انہوں نے پختہ عہد کے بعد روگردانی کی۔ اور خلیفۂ وقت کے احکام کی تعمیل سے نہ صرف انکار کر دیا۔ بلکہ مقابلہ پر کھڑے ہو گئے۔ اور یہاں تک بڑھے۔ کہ جس انسان کو اپنا خلیفہ اور واجب الاطاعت مان کر اس کے ہاتھ پر بک چکے تھے۔ اپنی تحریر و تقریر میں اسی کو

ستّرا بہتّرا

کے نام سے پکارنے اور لکھنے لگے۔ حویلی کے تعصب کی ذیل میں ان مخلصین نے جو کچھ لکھا اور کہا۔ اس کا مشتے نمونہ خروارے یہ تھا:۔

۱۔" ... خلیفہ صاحب کا تلون مزاج بہت بڑھ گیا ہے۔ اور عنقریب ایک نوٹس جاری کرنے والے ہیں۔ جس سے اندیشہ بہت بڑے ابتلا کا ہے .... اگر اس میں ذرا بھی تخالف خلیفہ صاحب کی رائے سے ہو۔ تو برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ ..... سب حالات عرض کئے گئے۔ مگر اُن کا جوش فرو نہ ہُوا۔ (مرزا یعقوب بیگ)

۲۔ حضرت مولوی صاحب کی طبیعت میں ضد اس حد تک بڑھ گئی ہے۔ کہ دوسرے کی سن ہی نہیں سکتے۔ وصیت کو پس پشت ڈال کر خدا کے فرستادہ کے کلام سے بے پرواہی کرتے ہُوئے شخصی وجاہت اور حکومت ہی پیش نظر ہے سلسلہ تباہ ہو تو ہو۔ مگر اپنے منہ سے نکلی ہُوئی بات نہ ٹلنے پر نہ ٹلے ...... تکبّر اور نخوت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ نیک ظنی نیک ظنی کی تعلیم دیتے دیتے بدظنی کی کوئی انتہا نظر نہیں آتی۔ وغیرہ" (سید محمد حسین شاہ)

یہ مختصر سا اقتباس ان لوگوں کی دلی حالت۔ قلبی کیفیت اور ایمانی قوت کے دیکھنے۔ سمجھنے اور جانچنے کی سچی کسوٹی۔ صحیح میزان اور بے خطا ناپ ہیں۔ جن سے اُن کے ایمان و اخلاص اور تقویٰ و طہارت کی قدر و قیمت معلوم ہو سکتی ہے۔ جہاں تک ایمان و اخلاص۔ محبت و وفا اور اطاعت و بیعت کے مفہوم و معانی کے متعلق ہمارا علم ہے مندرجہ بالا حالات میں باقی رہتا نظر نہیں آتا۔ مگر نہ معلوم اُن اصحاب کے نزدیک کیا مفہوم و معانی تھے۔ اور کیسا سخت جان وہ ایمان اور اخلاص تھا۔ کہ اتنی تیز اور دوشاخی چھریوں سے بھی کاٹے کٹا نہ توڑے ٹوٹا۔ اور وہ بزرگ اتنا کچھ کہنے اور لکھنے کے باوجود بھی پکے اور مخلص مبائع احمدی بنے رہے۔

بصیرہ کی حویلی کے امتحان میں پھر وہ لوگ اس طرح ناکام و ذلیل ہُوئے۔ اور حالات نے اتنی نزاکت اختیار کر لی تھی۔ کہ

یوم العید

آخران کے اخراج از جماعت کے لئے مقرر بھی ہو چکا تھا۔ خواجہ صاحب ان دنوں کشمیر میں تھے۔ ان حالات کی اطلاع پا کر انہوں نے پھر حق رفاقت ادا کیا۔ یا "مصلحت وقتی" کے ماتحت کوشش کر کرا کے کوئی راہ دفع الوقتی کی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کچھ اپنے رفیقوں کو سمجھایا۔ اور کچھ دربارِ خلافت میں عرض معروض کر کے

خلیفۂ وقت کے جذبات رحم

کو ابھارا۔ اور آپ کو ان لوگوں کے تائب اور آئندہ اصلاح کر لینے کے عہد پیش کر کے معافی کے اعلان پر آمادہ کر لیا۔ دوسری طرف حضرت میر ناصر نواب صاحب نے بھی ان لوگوں کے واویلا ندامت اور پشیمانی سے متاثر ہو کر دربار خلافت میں درخواست رحم پیش کی۔ چنانچہ آپ نے اس کا یوں ذکر فرمایا۔ کہ:۔

"بارہا رد و کد ہوتے ہوتے حضرت نور الدین اعظمؓ کی ناراضگی فرو ہوئی۔ اور عید کے دن احباب کے سر سے خدا خدا کر کے یہ بلا ٹلی۔ اور اُن کی طرف سے معافی نامہ حضرت خلیفہ اوّل کی خدمت میں پیش ہُوا"

چنانچہ حضرت نور الدین اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو مجسم رحم اور کرم واقع ہُوئے تھے۔ جن کی زبان مبارک پر یہ مقولہ عموماً جاری ہوتا۔ کہ

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اور جن کو یہ فکر لگی رہتی تھی۔ کہ:۔

"میرے پاؤں اب قبر میں لٹکے ہُوئے ہیں۔ موت سامنے نظر آتی ہے۔ نہ معلوم کس وقت پیغام اجل آکر دنیا و مافیہا سے جدا کردے اپنے آقا کے حضور حاضر ہو کر کیا یہ جواب دوں گا۔ کہ آپ کے خون جگر کے سینچے ہُوئے باغ کے درختوں کو میں نے جڑوں سے اکھیڑا کاٹا اور باغ سے باہر پھینک دیا۔ خشک شاخ۔ درخت اور تنے سے جدا ہونیوالے بدقسمت۔ بدعہد اور بدکردار تو ضرور اپنی کیفر کردار کو پہونچیں گے۔ مگر میں کسی **کی ٹھوکر کا موجب بننے سے حتی الوسع بچتا اور رکتا ہی رہتا ہوں** اس امید پر کہ شاید یہ لوگ اب بھی توبہ کر کے باز آئیں۔ اور اصلاح کر لیں۔

چنانچہ حضور نے یہ فرماتے ہُوئے

"مجھے دوبارہ بیعت لینے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے پہلے معاہدہ پر قائم رہو۔ ایسا نہ ہو کہ نفاق میں مبتلا ہو جاؤ۔ اگر تم مجھ میں کوئی اعوجاج دیکھو۔ تو اس کی استقامت کی دعا سے کوشش کرو۔ مگر یہ گمان نہ کرو۔ **کہ تم مجھ بڈھے کو آیت یا حدیث یا مرزا صاحب کے کسی قول کے معنے سمجھا لوگے۔** اگر میں گندہ ہوں۔ تو یوں دعا مانگو۔ کہ خدا مجھے دنیا سے اٹھا لے۔ پھر دیکھو کہ دعا کس پر الٹی پڑتی ہے؟ توبہ کرو۔ اور دعا کرو۔ اور پھر دعا کرو۔ میں فروری دسمبر گویا نو ماہ سے اس دکھ میں مبتلا ہوں ...... بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ ہم تمہاری نسبت نہیں بلکہ اگلے خلیفے کے اختیارات کی نسبت بحث کرتے ہیں۔ مگر تمہیں کیا معلوم۔ کہ وہ ابوبکرؓ اور مرزا صاحب سے بھی بڑھکر آئے"

درگذر فرمایا۔ معافی دیدی۔ اور ستاری اور چشم پوشی سے کام لیتے ہُوئے اخراج از جماعت کے اعلان کو روک لیا۔

یک نہ شد دو شد

قارئین کرام شاید تعجب کریں۔ اور حیرت و

و استجاب ہیں پڑجائیں گے۔ کہ اتنی عظیم المرتبت ہستیاں ایثار پیشہ و خدمتگذار شخصیتیں۔ کاروبار سلسلہ کے گویا رکن رکین۔ اور یہ تلون۔ عہد شکنی و دوبارہ کی توبہ و بیعت ۱۹ اور مجھے تو خود بھی اس بات کا اعتراف ہے۔ کہ واقعی یہ تمام لوگ ابتداءً کمالِ اخلاص و محبت۔ ایثار و قربانی۔ جاں نثاری و وفاداری کے اوصاف سے متصف۔ مزین اور مستور تھے۔ ان کے کارہائے نمایاں۔ ان کی خدمات بے مثال۔ وہ یقیناً

صالح تھے اور نیک ارادے رکھتے تھے

خدائے واحد و یگانہ۔ عالم الغیب والشہادہ نے خود اپنے قول سے ان صفات کی تصدیق فرمائی۔ مگر خدا جیسا کہ نقطہ نواز ہے۔ نقطہ گیر بھی ہے۔ ظلم اس کی ذات اقدس کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا لیس اللّٰہ بظلام للعبید۔ مگر ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم بھی نص صریح ہے۔ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اکثر فرمایا کرتے۔ بلکہ حضور کا تکیہ کلام تھا۔ کہ:-

"احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون۔ اور کہ حکم خاتمہ اور انجام پر لگا کرتے ہیں"

الوصیت حضرت اقدس نے ارقام فرمائی۔ مسودہ خواجہ صاحب اور مولوی محمد علی صاحب دونو کو پڑھنے اور قانونی نگاہ سے غور کرنے کو دیا۔ شیخ رحمت اللہ صاحب۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب۔ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب اور ہمارے محترم حضرت مولانا مولوی سید محمد سرور شاہ صاحب اسی حجرہ میں جمع تھے مسودہ پڑھا گیا۔ اور سبھی نے سن لیا۔ اور پھر اپنے مشاغل میں معروف ہو گئے۔ خواجہ صاحب نے اس کو پھر پڑھا۔ اور غور کیا۔ بار بار پڑھا اور گہری سوچ بچار کے بعد بول اٹھے۔

واہ او مرزیا

مولوی محمد علی صاحب کچھ لکھنے میں معروف تھے وہ لکھتے اور اپنے کام میں لگے رہے۔ خواجہ صاحب سے نہ رہا گیا۔ اور پھر بولے کہ:-

"مجھے سمجھ آگئی ہے۔ اور ان کو (مولوی محمد علی صاحب کو) نہیں آئی۔ مرزا صاحب نے تمہاری سلطنت قائم کردی۔ نہ صرف ملکانہ بلکہ بادشاہانہ حقوق و اختیارات قائم کر دیئے ہیں۔ اب اس سے فائدہ اٹھانا آپ کی عقلمندی اور حسن تدبیر پر منحصر ہے۔ مرزا صاحب نے اپنا کام کر دیا۔ اب یہ آپ کا کام ہے۔ کہ اس کو ورثہ و گدی نہ بننے دیں۔ اور کماحقہ فائدہ حاصل کریں"

قرآن کریم کلام ربانی۔ سراسر نور۔ ہدایت اور رحمت ہے۔ مگر اللہ کریم فرماتے ہیں۔ یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا۔ اسی طرح ہر رحمت۔ زحمت اور مفید چیز بد استعمال سے مضر بن جاتی ہے۔ الوصیت خدا کے مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تحریر فرمائی۔ وہ خزانہ نور۔ باعث رحمت اور موجب صد ہزاراں برکات ہے۔ مگر مثل مشہور ہے۔ کہ کسی نے ایک بھوکے سے پوچھا تھا۔ کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ سوال اتفاقاً اس وقت بہت بھوکا تھا۔ اور بھوک کے غلبہ کی وجہ سے طبعاً اس کے دماغ پر روٹی کے خیال کا غلبہ تھا۔ جواب میں بے اختیار بول اٹھا

دو اور دو چار روٹیاں

الغرض ہمارے ان متقدر اصحاب کو الوصیت میں بڑی سے بڑی چیز جو دکھائی دی۔ وہ حکومت و سلطنت اور اختیار و اقتدار کا ملنا تھا۔ چنانچہ یہی وہ خیال ہے۔ جو میلان طبع۔ قلبی کیفیت اور اُن کے خیالات کی رو کے ماتحت اُن کے دل و دماغ میں پرورش پاتا۔ مضبوط ہوتا اور بڑھتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اُن پر کچھ ایسا مسلط و مستولی ہوا۔ کہ اس نے اُن کی توجہات کو ہر طرف سے ہٹا کر اسی مرکز پر جمع کر دیا۔ اور اس طرح یہ بزرگ

حکومت و سلطنت کے خواب دیکھنے
اختیارات و اقتدار کے قلعے بنانے

میں ہمہ تن اور ہمہ توجہ معروف ہو گئے۔ چنانچہ آپ کو غور کرنے اور سوچنے سے یہ امر اس طرح مشہور و محسوس نظر آنے لگے گا۔ کہ تمام جھگڑوں۔ سارے فتنوں اور ساری مساعی کی تہ میں آپ اسی جذبہ کو کارفرما پائیں گے۔ یہی خواہشِ حکومت تھی۔ جس کے قیام کی آرزو اُن کو بیعت کے بعد بغاوت پر۔ اقرار اطاعت و فرمانبرداری کے بعد سرکشی و روگردانی پر۔ اور اظہار ندامت و پشیمانی کے بعد توبہ شکنی و طغیانی پر آمادہ کرتی اور اکساتی تھی۔ اور نشہ حکومت۔ تمنائے سلطنت اور حصول اقتدار و اختیار کی خواہش نے دنیا میں کیا کیا کارہائے نمایاں کرائے؟ تاریخ ایسے واقعات سے پٹی پڑی ہے۔ اور عجب نہیں۔ کہ اس کے علاوہ الوصیت کے سمجھنے میں اُن کو کوئی غلطی بھی لگی ہو۔ جس کی وجہ سے وہ قابل معافی و درگزر سمجھے جانے چاہئیں۔ مگر جب خلیفۂ وقت نے اُن کو نہ صرف ایک مرتبہ بلکہ دوبار معاف کر کے جہاں رجوع و اصلاح اور توبہ و انابت کا موقعہ بہم پہنچایا وہاں یہ فرماتے ہوئے۔ کہ

"مگر یہ گمان نہ کرو۔ کہ تم مجھ بڈھے کو آیت یا حدیث یا مرزا صاحب کے کسی قول کے معنے سمجھا لوگے"

اُن پر اتمام حجت فرما دیا۔ اور الوصیت کے سمجھنے میں کسی غلط فہمی کے عذر کا امکان ہی باقی نہ رہنے دیا تھا۔ لہٰذا اب آئندہ کے لئے تو ان اصحاب کو محتاط اور اپنے عہد کا پابند رہنا چاہیئے تھا۔ مگر افسوس کہ یہ سلسلہ ختم ہوا پر نہ ہوا۔ اور چلتا ہی چلا گیا۔ کبھی ظاہر تو کبھی باطن۔ کبھی کھلم کھلا اور علی الاعلان تو کبھی پوشیدہ و در پردہ۔ اور ان لوگوں کی ایسی حرکات اور کارروائیوں سے سیدنا حضرت خلیفہ اول رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سخت تکلیف ہوا کرتی۔ حتیٰ کہ ہوتے ہوتے نوبت بایں جا رسید کہ حضور نے تنگ آکر یہاں تک لکھ دیا۔ کہ:-

"میرے مرنے پر ان کو ضرور دقت پیش آئے گی۔ اگر اصلاح نہ ہوئی۔ افسوس"

اسی پر بس نہیں۔ کسی اور معاملہ میں رنج و غم اور افسوس کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا۔ کہ:-

"آپ کا پیغام جنگ پہنچا۔ مولوی محمد علی اور خواجہ کمال الدین کی بیعت کرلو۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون"

اور یہ وہ حقائق ہیں۔ جو ۱۹۱۳ء کے اواخر یعنی حضرت خلیفہ اول رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات سے صرف چند ماہ قبل تک ظہور پذیر ہوتے چلے گئے۔ بلکہ ان کی صورت و شکل کو دوسرا رنگ دے دیا گیا۔ اور پہلو بدل کر نئے طریق۔ جدید اسلوب پر اس جنگ کی طرح ڈالی گئی۔ یہ اصحاب حل و عقد اپنے مخالفانہ حرکات سے کبھی باز آئے نہ تائب ہوئے۔

"مولوی محمد علی اور خواجہ کمال الدین کی بیعت کرلو۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون"

کا فقرہ جس حقیقت کا مظہر ہے۔ وہ عیاں ہے۔ اور عیاں را چہ بیان؟ مگر تعجب اور طرفہ یہ کہ معاملہ کے اس انتہا کو پہنچ جانے کے باوجود وہ بزرگ نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کرتے۔ کہ کوئی زبان پر بھی لاسکے کہ

پھر تو بیعت فسخ ہوگئی۔ اور وہ لوگ خارج از جماعت ہو گئے۔

بلکہ کلمہ حق کہنے اور زبان ہلانے والوں سے دست و گریبان ہونے کو تیار۔ اور آمادہ بہ فساد نظر آتے ہیں۔ الغرض یک نہ شد دو شد۔ بلکہ دو نہ شد سہ شد" اس جنگ کی حد ہی ہو گئی۔ اور اس کے لڑنے والوں نے کمال ہی کر دکھایا۔ اور مثل

آزمودہ را آزمودن

کی صداقت پر بار بار اپنے عمل سے مہر تصدیق ثبت کردی۔

فانا للّٰہ وانا الیہ راجعون

میں بہت سی تفاصیل اور واقعات کو چھوڑتا۔ حوالہ بخدا کرتا اور خواہشمندان تفاصیل کو حضرت مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب فاضل کے مرتبہ رسالہ موسوم بہ خلافت احمدیہ کو مٹانے اور جماعت احمدیہ کو منتشر کرنے کے لئے اہل پیغام کے

بعض خاص کارنامے"

کے مطالعہ کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ جس میں فاضل اور واجب الاحترام مصنف و مرتب نے نہایت قابلیت کے ساتھ۔ پوری شرح و بسط سے ان حالات پر ایک گہری اور محققانہ نظر ڈالی۔ اور آنے والی نسلوں کے واسطے حقیقت حال سے واقف و آگاہ ہونے اور حق و صداقت تک پہنچنے کا بے نظیر مواد اور معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ شکر اللّٰہ سعیہ۔ تقبل عملہ و اعظم اجرہ۔ بات لمبی ہو گئی۔ اور مقصود ابھی میرا دور ہے۔ لہٰذا مختصر کرتا اور اشاروں ہی پر اکتفا کرتا ہوا آگے بڑھتا ہوں۔

حکومت و سلطنت کے حصول کی ہوس اور الوصیت سے پیدا شدہ ایک خیالی غلط فہمی کے علاوہ تیسرا بڑا مرض ان اراکین کے دلوں میں

عداوتِ محمود اور بغضِ خاندان

تھا۔ جو ان کو کبھی کروٹ چین لینے دیتا نہ وہ آرام کی نیند سو سکتے تھے۔ اور یہ اُن کے ہر شعبۂ زندگی۔ حرکات و سکنات۔ نشست و برخاست۔ خلوت و جلوت اور تحریر و تقریر غرض ہر رنگ میں اتنا نمایاں واضح اور عیاں ہو چکا تھا۔ کہ چھپانے سے چھپتا نہ دبانے سے دبتا بلکہ روز افزوں تھا۔ الزام تراشی۔ سوء ظنی اور بدگمانی سے ایسی ایسی بے پر کی ہانکی اور اڑائی جاتیں۔ اعتراض کئے جاتے۔ مخالفانہ پروپاگنڈا کیا جاتا۔ جو اس معصوم۔ ناکردہ گناہ بلکہ مظلوم ہستی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتیں۔ اس انبار کے اندراج و تکرار کی بجائے میں صرف دو قول ان کی رکن رکین ہستیوں یعنی مولوی محمد علی صاحب اور خواجہ کمال الدین صاحب کے لکھنے کے بعد اُن کے اعتراضات کے جواب کا صرف تھوڑا سا حصہ درج کر دیتا ہوں۔ جو میرے آقا سیدنا محمود ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مجبور ہو کر۔ تنگ آکر۔ بادل ناخواستہ لکھا۔ اور شائع فرمایا تھا۔ مولوی صاحب نے جہاں بدظنی کر کے خاندان نبوت اور الدار سے بے تعلقی کا اظہار کیا۔ وہاں انہوں نے دلی رنج کا بھی اظہار و اعلان کر دیا۔ چنانچہ اپنی رفیقہ حیات محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ مرحومہ کی وفات کے ذکر کی ذیل میں خاندان نبوت کے اراکین کیطرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا۔ کہ:-

"ہاں سب برابر نہیں ہوتے۔ اگر کسی نے میرا محسن ہونے کے باوجود بجائے اظہار غم و ہمدردی کے کسی گذشتہ رنج کا اظہار اس وفات کے وقت کیا۔ تو یہ شاید میرے لئے سبق تھا۔ کہ دنیا کے کسی گھر کو اپنا گھر سمجھنا غلطی ہے" (ریویو ص ۴۸)

اور خواجہ صاحب نے مدرسہ احمدیہ کے ایک کمرہ میں مجلس کی ایک میٹنگ کے وقت جو کچھ کہا۔ وہ جہاں نہایت ہی دلدوز۔ رنجدہ اور روح فرسا ہے وہاں ان لوگوں کی قلبی کیفیت۔ دلی حالت اور تعلّی و استکبار کا بھی آئینہ دار ہے۔

"ہماری غلطی ہے۔ کہ میاں میاں کہہ کہکر ہم نے آپ کو سر چڑھا لیا۔ ہم میاں کہنا چھوڑ دیں۔ پھر دیکھیں گے۔ کہ کون آپ کو میاں کہکر محبت و عزت سے یاد کرتا ہے"

اللّٰہ! اللّٰہ!! وہ قوم جس نے علو و استکبار اور تعلّی و استحقار کرنے والوں کے انجام اپنی آنکھوں دیکھے نہ ایک بار بلکہ بار بار۔ اور خدا کے نبی و رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی موجودگی میں دیکھے۔ اور بطور نشان ہائے خداوندی اور آیات الٰہی دیکھے۔ اُن کے زبان سے نکلا تو کیا نکلا؟ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر۔ سچ ہے۔ اذا نصر اللّٰہ المؤمن جعل لہ الحاسدین فی الارض۔ تذکرہ صفحہ ۸۳۔ پس محمود کا محسود ہونا اس کے منصور و موید ہونے کی علامت اور اس کی صداقت کی دلیل ہے۔ جس کی شہادت کلام الٰہی میں موجود ہے۔ سیدنا مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کا الہام

انی احافظ کل من فی الدار
الا الذین علوا باستکبار

سچا۔ درست اور حقیقت حال پر مبنی ہے۔ حضور کے الدار میں رہائش رکھنے والے ایک بزرگ کو ایام طاعون میں کچھ تکلیف ہو گئی۔ نہایت شدت کا بخار اور آثار مرض تھے۔ اُن کو خود بھی شبہ بلکہ یقین طاعون کا ہوا۔ ڈرے اور سخت خوفزدہ ہوئے۔ حضرت کے حضور دعا کے لئے التجا کی۔ حضور کو

ان کے دلی خطرہ کا علم ہوا۔ دعا فرمائی۔ اور اس طرح خداوند نے معجزانہ شفا بخش کر اپنے قول کی صداقت کا اظہار فرمایا۔ اور ظاہری مرض اور وبائی بلا سے نجات بخشکر اپنے وعدہ کے ایک پہلو کو پورا کر دکھایا۔ مگر جب انہوں نے روحانی الدار کو چھوڑ دیا۔ تخت گاہ رسول سے الگ ہو کر قطع تعلق کر لیا۔ اور بدظنی۔ تعلی واستکبار کا ایسا طریق اختیار کیا تو روحانی سزا دیکر الہام کا دوسرا حصہ بھی پورا کر دکھایا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اب میں ذیل میں سیدنا محمود ایدہ اللہ الودود کے اس جواب کا ایک حصہ درج کر دیتا ہوں۔ جو حضور پُرنور نے بعض بزدل معترضین کے الزامات اور مخفیہ ٹریکٹ واشتہارات شائع کرنے والوں کو دیا۔ اور اسی حصۂ جواب ہی سے اُن اعتراضات کا قارئین کرام اندازہ فرمالیں گے۔

"افسوس میں نے اپنے دوستوں سے وہ سنا۔ جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے نہ سنا تھا میرا دل حسرت واندوہ کا مخزن ہے۔ اور میں حیران ہوں۔ کہ میں کیوں اس قدر مورد عتاب ہوں۔ بے شک وہ بھی ہوتے ہیں۔ جو غم وراحت میں اپنی عمر گذارتے ہیں۔ مگر یہاں تو وہ جھاتی قفس میں داغ سے اپنے ہے رشک باغ جوش بہار تھا۔ کہ ہم آئے اسیر ہو اگر میں تبلیغ دین کے لئے باہر نکلتا ہوں۔ تو کہا جاتا ہے۔ کہ لوگوں کو بہلانے کے لئے اپنی شہرت کے لئے اپنا اثر اور رسوخ پیدا کرنے کے لئے اپنی حمائتیں بنانے کے لئے نکلتا ہے۔ اور اس کا باہر نکلنا اپنی نفسانی اغراض کے لئے ہے۔ اور اگر میں اسی اعتراض کو دیکھ کر اپنے گھر بیٹھ جاتا ہوں۔ تو یہ الزام دیا جاتا ہے۔ کہ یہ دین کی خدمت میں کوتاہی کرتا ہے۔ اور اپنے وقت کو ضائع کرتا ہے اور خالی بیٹھا دین کے کاموں میں رخنہ اندازی کرتا ہے۔ اگر میں کوئی کام اپنے ذمہ لیتا ہوں تو مجھے سنایا جاتا ہے۔ کہ میں حقوق کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا ہوں۔ اور قومی کاموں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں۔ اور اگر میں دل شکستہ ہو کر جدائی اختیار کرتا ہوں۔ اور علیحدگی میں اپنی سلامتی دیکھتا ہوں۔ تو یہ تہمت لگائی جاتی ہے۔ کہ یہ قومی درد سے بے خبر ہے۔ اور جماعت کے کاموں میں حصہ لینے کی بجائے اپنے اوقات کو رائیگاں گنواتا ہے۔ مگر مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں عام انسانوں سے زیادہ کام کرتا ہوں حتیٰ کہ اپنی صحت کا بھی خیال نہیں رکھتا۔ مگر اسے جانے دو۔ مجھے تم خود ہی بتاؤ۔ کہ وہ کونسا تیسرا راستہ ہے۔ جسے میں اختیار کروں۔ خدا کے لئے مجھے اس طریق سے آگاہی دو۔ جس پر ان دونوں راستوں کو چھوڑ کر میں قدم زن ہوں۔ للہ مجھے وہ سبیل بتاؤ۔ جسے میں اختیار کروں۔ آخر میں انسان ہوں۔ خدا کے پیدا کئے ہوئے دو راستوں کے علاوہ تیسرا راستہ میں کہاں سے لاؤں۔

صبح شام۔ رات دن۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ یہ باتیں سن سن کر میں تنگ آگیا ہوں۔ زمین باوجود فراخی کے مجھ پر تنگ ہو گئی ہے۔ اور آسمان باوجود وسعت کے میری لئے قید خانہ کا کام دے رہا ہے۔ اور میری وہی حالت ہے۔ کہ ضاقت علیھم الارض بما رحبت وضاقت علیھم انفسھم وظنوا ان لا ملجاء من اللّٰہ الا الیہ

افسوس کہ میرے بھائی مجھ پر تہمت لگاتے ہیں۔ اور میرے بزرگ مجھ پر بدظنی کرتے ہیں لوگ کہتے ہیں۔ کہ دنیا میں ڈیڑھ ارب آدمی بستا ہے۔ مگر مجھے تو سوائے خدا کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ لوگ اس دنیا میں تنہا آتے اور یہاں سے تنہا جاتے ہیں۔ مگر میں تو تنہا آیا۔ اور تنہا رہا۔ اور تنہا جاؤں گا۔ یہ زمین میرے لئے ویران جنگل ہے۔ اور یہ بستیاں اور شہر میرے لئے قبرستان کی طرح خوش ہیں۔ میرے دوست اس وقت مجھے معاف فرمائیں۔ میں ان کی محبت کا شکرگذار ہوں لیکن میں کیا کروں۔ کہ جہاں میں ہوں۔ وہاں وہ نہیں ہیں۔ میں ان مہربانوں کے مقابلہ میں جو مجھے آئے دن ستاتے رہتے ہیں۔ اُن کی محبت کی قدر کرتا ہوں۔ ان کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اپنے رب سے ان پر فضل کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔ لیکن باوجود اس کے میں تنہا ہوں۔ میری مثال ایک طوطے کی ہے۔ جس کا آقا اس پر مہربان ہے۔ اور اس سے نہایت محبت کرتا ہے۔ اور طوطا بھی اس کے پیار کے بدلہ میں اس سے اُنس رکھتا اور اس کی جدائی کو ناپسند کرتا ہے۔ مگر پھر بھی اس کا دل کہیں اور ہے۔ اس کے خیال کہیں اور ہیں۔

میرے آقا کا دلبند میرا مطاع امام حسینؓ تو ایک دفعہ کربلا کے ابتلا میں مبتلا ہوا لیکن میں تو اپنے والد کی طرح یہی کہتا ہوں۔ کہ

کربلائیست سیر ہر آنم
صد حسین است در گریبانم (الفضل ۲۵/۱)

فماذا بعد الحق الا الضلال۔ اس جواب کے بعد اور اظہار حقیقت پر بھی اگر کسی کا دل تسلی نہیں پاتا۔ بدظنی کرکے زبان طعن کھولتا اور اعتراضات سے نہیں رکتا تو وہ یقیناً اپنی کور باطنی۔ تعصب۔ ضد اور ہٹ دھرم پر مہر تصدیق ثبت کرتا۔ اور اس پر بعینہٖ

بینا و نابینا کے مل کھانے

کا واقعہ اپنی پوری کیفیت کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے

الغرض ایسے اور ایسی حالات میں سے گذرتے ہوئے ہم لوگ دن اور دنوں کے بعد ہفتے۔ ہفتوں کے بعد مہینے اور سال بسر کرتے چلے گئے۔ عجیب در عجیب واقعات۔ نئے سے نئے حالات کانوں میں پڑتے اور دلوں کو چھید اکرتے تھے۔ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ تعالےٰ عنہ قضا را ہی سے گھوڑی پر سے گر گئے۔ بہت چوٹیں آئیں۔ حالات نازک ہو ہو جاتے رہے۔ خدا نے فضل کیا شفا بخشی۔ اور پھر آخر وہ موعود ومقدر گھڑی قریب آپہنچی۔ جو

کل نفسٍ ذائقۃ الموت

میں مفہوم ہے۔ بیماری لمبی ہو گئی۔ ضعف و نقاہت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر طبیب اور وید حکیم سبھی ان قابو یافتگان کی مرضی واشارہ پر چلتے۔ کوئی علاج اُن کی اجازت کے بغیر ہو سکتا نہ تشخیص۔ اپنے مصالح اور حکمتوں کے ماتحت جو چاہتے وہ کرتے تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ اپنے سوا یہ لوگ کسی دوسرے کا دخل پسند ہی نہ کرتے تھے۔ ایسی حالات میں وہ **قضاء ہی قضاء مبرم** ثابت ہوئی۔ مگر اس سلسلہ میں جو ناکہ بندی اور محاصرہ حضرت ممدوح کا ان برسرِ اقتدار اصحاب نے کئے رکھا۔ اور جس طرح اپنے ہم خیالوں کے علاوہ دوسرے مخلصین اور غرباء تک کو جہاں تیمارداری اور خدمت سے محروم رکھا وہاں صحیح حقیقت حال سے بھی ناواقف رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی رہی۔ حتیٰ کہ بعض ایسے راز ہیں۔ جن کی بنا پر حضرت خلیفہ اوّل نے بھی بھاری تکلیف محسوس کرکے کسی دوسری جگہ جانا پسند فرمایا۔ چنانچہ ایسے ہی بعض وجوہ کے ماتحت حیات نور کے آخری چند ایام حضرت نواب صاحب قبلہ نواب محمد علیخاں صاحب کے دولت سرائے میں گذرے۔ اگرچہ کوشش ان بزرگوں کی اس نقل مکانی کے وقت بھی یہی تھی۔ کہ "سرکاری عمارت" ہی میں رکھا جائے۔ جہاں ان کے سوا کسی اور کا دخل نہ ہو۔ مگر مصلحت الٰہی نے یہ سعادت حضرت نواب صاحب کے حصہ میں مقدر کر رکھی تھی۔ جن کا گھر فراخ اور سب کے لئے برابر یکساں کھلا تھا۔ جہاں ہر ممکن سہولت۔ ممکن خدمت اور علاج معالجہ۔ غذا وہوا اور آرام کے سامان مہیا تھے۔ خدمت تو کی ہو گی ہر کسی نے علیٰ قدر مراتب۔ مگر جس والہانہ طریق عاشقانہ رنگ اور فنائیت کی ادا سے سیدنا محمود ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز بے جگری سے آپ پر گرے رہے۔ خدمت کے لئے کھڑے رہے۔ رات آرام کیا نہ دن۔ اس کی نظیر ناممکن اور اندازہ محال ہے۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو جو عشق ومحبت سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھا۔ اطاعت وفرمانبرداری اور فنائیت کا جو مقام ان کو میسر تھا۔ اس سے بھی کہیں بڑھ کر حضرت محمود نے عشق ومحبت۔ خدمت وفنائیت اور اطاعت وفرمانبرداری کا نمونہ قائم کر دکھایا۔

۱۳ مارچ ۱۹۱۴ء کی صبح کو آپ دارالسلام سے شہر آئے۔ اور کچھ غیر معمولی فکر۔ تشویش اور پریشانی کے اثرات آپ کے چہرہ سے عیاں تھے آپ جلد جلد ادھر اُدھر آتے جاتے۔ اور بعض ضروری کام سرانجام دیتے رہے۔ فراغت کے بعد فرمایا:۔

"بھائی جی آپ لاہور جائیں

حکیم محمد حسین صاحب مرہم عیسیٰ کو کل سے لاہور بھیجا ہوا ہے۔ وہ ابھی تک کستوری لے کر نہیں لوٹے۔ حضرت مولوی صاحب کی طبیعت بے حد کمزور ہے۔ کستوری کی ضرورت ہے۔ آپ جا کر لے آئیں۔ اگر حکیم صاحب معہ کستوری مل جائیں تو لوٹ آئیں۔ گاڑی کا وقت بہت تنگ ہے۔ کوشش کرکے اس کو پکڑ لیں۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو کستوری لے کر آئیں"

میں نے عرض کیا۔ حضور وقت اتنا تھوڑا ہے کہ کوئی بیکہ گاڑی پر پہنچا سکے گا اور نہ ہی دوڑ کر گاڑی کو پکڑا جائے گا۔ کوئی سائیکل ہو تو میں انشاء اللہ تعالےٰ انتہائی کوشش کروں گا۔ فرمایا:۔

"میں اپنا سائیکل لاتا ہوں آپ تیار رہیں"

گھر جا کر جلد جلد خود سائیکل لائے۔ میں نے ہوا بھری اور خدا کا نام لے کر بٹالہ کو روانہ ہوا۔ سڑک ہماری اس زمانہ میں اتنی خراب۔ خستہ اور ریت سے اَٹی رہتی تھی۔ کہ آج کل کی سڑک اس کے مقابل میں پختہ کہلانے کی مستحق ہے۔ میں نے پورا زور لگایا۔ اور ساری طاقت خرچ کی۔ باوجود ریت کی کثرت کے کہیں اترا نہ ٹھیرا۔ اور چلاتا ہی چلا گیا۔ تب جا کر میں خدا خدا کر کے اسٹیشن پر پہنچا۔ گاڑی کھڑی تھی۔ حالت میری یہ تھی کہ سائیکل سے اترا تو ٹانگیں میرے جسم کے بوجھ کی برداشت سے عاری اور نکمی ہو چکی تھیں۔ سائیکل پھینک

ہاتھ اور پاؤں کے بل

حیوانوں کی طرح سیڑھیوں پر چڑھا۔ ایک دوست سامنے نظر آئے۔ سائیکل اُن کو سونپ گاڑی میں جا بیٹھا۔ لاہور پہنچکر کری حکیم محمد حسین صاحب کے متعلق معلوم کیا۔ تو پتہ لگا کہ رات وہ گاڑی سے رہ گئے تھے۔ آج صبح کستوری لے کر قادیان چلے گئے ہیں۔ اس طرح واپسی کے لئے مجھے شام کی گاڑی کی انتظار کرنا پڑی۔ جمعہ کا دن تھا۔ قادیان سکول کے طلباء ٹورنامنٹ میں شرکت کی غرض سے لاہور میں تھے۔ وہیں نماز جمعہ ادا کی۔ عصر کا وقت ہو گا کہ حضرت

نور الدین اعظمؓ کی وفات

کا تار پہنچ گیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ دل اداس تھا۔ چین تھا نہ قرار۔ خبر سنتے ہی اسٹیشن پر پہنچا۔ جہاں اکّے دکّے احمدی احباب آ اور گاڑی کی انتظار میں جمع ہو رہے تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں ٹریکٹ تھا۔ جسے وہ پڑھتے اور ادھر اُدھر ٹہلتے پھرتے تھے۔ میں نے کسی سے پوچھا نہ ہی کسی نے بتایا۔ کہ وہ کیا تھا۔ میرا دل اس صدمہ کی وجہ سے دلگیر اور رنجور تھا۔ کسی سے بات چیت کرنے کی بجائے گوشۂ خلوت کی خواہش وتلاش تھی۔ جہاں علیحدہ بیٹھا دعائیں کروں۔ اور پیش آمدہ حالات کے لئے اپنے خدا سے راہ نمائی ومدد مانگوں۔ فتنے بہت تھے۔ جھگڑے خطرناک اور حالات نازک جن کے خیال سے پریشانی بہت ہی کچھ بڑھی ہوئی تھی۔ اور آنے والے مرحلہ کی فکر سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔

اتنے میں شمال اور جنوب سے آنے والی گاڑیاں آئیں۔ اور لاہور کے دوست بھی کثرت سے آن پہنچے ہر طرف اس ٹریکٹ کا چرچا۔ بحث مباحثہ۔ حیص بیص اور شور وغوغا تھا۔ بیرونجات سے آنے والے دوست ٹریکٹ کو پڑھ اور اس کے مضمون سے آگاہ ہو کر آ رہے تھے۔ مگر لاہور والے اکثر ابھی اس کے پڑھنے میں مشغول تھے۔ اس گرماگرمی نے میری توجہ کو اپنی طرف کھینچا۔ اور آخر ایک کاپی اس ٹریکٹ کی میرے ہاتھ پڑ گئی جسے لے کر پڑھنا شروع کیا۔ پڑھا اور حقیقت حال سے آگاہی پائی۔ اور بیساختہ دل سے

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

کی صدا بلند ہوئی۔ مصیبت پر مصیبت۔ اور اس نئے فتنہ کے درد میں سر کو پیٹ لیا۔ اور نیم جان ہو کر ایک طرف بیٹھا۔ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

چھ سال قبل بھی تقریباً انہی حالات میں۔ اسی گاڑی سے سفر کرنے کا مجھے موقعہ ملا تھا۔ مگر اس وقت اور اس سفر کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق اور بعد المشرقین تھا۔ اس میں ہم سب پر ایک اداسی تھی۔ جس نے چھپا کر ہم سب کو اپنے دامن میں لپیٹا ہوا تھا۔ رقت تھی۔ جس کے باعث ہر دل پگھل کر موم بلکہ خون بن کر بہے جا رہا تھا۔ انابت تھی۔ تضرع اور ابتہال تھا۔ جس سے دل آستانہ الوہیت پر گرے۔ اور نصرت و مدد۔ دستگیری و راہ نمائی کے لئے چلا اور فریاد کر رہے تھے۔ عجز و نیاز۔ ذکر و اذکار اور خشوع خضوع کی وجہ سے وہ قافلہ گویا ملائکہ کی مجلس اور کروبیوں کا مجمع معلوم ہوتا تھا۔ جو حمد و ثنا اور تسبیح و تحمید میں مشغول۔ توحید اور جمال و جلال الٰہی کے گیت گا تا جا رہا تھا۔ مگر برخلاف اس کے ہمارے اس سفر کا نقشہ اپنے جنگ و جدال لڑائی جھگڑے۔ تُو تُو۔ مَیں مَیں۔ بحث مباحثے۔ اور فتنہ و فساد کی وجہ سے میدان کارزار کا سماں پیش کر رہا تھا۔ ایک کو دوسرے کے گرانے۔ دبانے اور غلبہ پانے کی کوشش میں دلائل و براہین کی بجائے رعب و تحکم اور جبر و تشدد سے بھی گریز نہ تھا۔ اور معاملہ بعض اوقات

باتوں کی بجائے لاتوں

اور دھمکیوں تک کو جا پہنچتا تھا۔ اسی رنگ میں ہمارا یہ سفر کٹتا گیا۔ میری طبیعت ان حالات سے بیزار تھی۔ برداشت نہ کر سکی۔ اور میں نے گہری سوچ۔ لمبی بچار اور دعاؤں کے بعد فیصلہ کر لیا۔ کہ جس طرح ہو اس ٹریکٹ کو جلد سے جلد مرکز میں پہنچا کر اس فتنہ و فساد کی اطلاع پہنچاؤں۔ اور جو کچھ دیکھ اور سُن رہا ہوں۔ حضرت کے حضور حاضر ہو کر سناؤں۔ کہ کن خیالات اور ساز و سامان نیز لاؤ لشکر کے ساتھ مرکز احمدیت اور تخت گاہ رسول پر خلافت کو مٹانے کی غرض سے وہ لوگ اُمنڈے چلے آ رہے ہیں۔

اس فیصلہ کے بعد میں نے اس ڈبے کو چھوڑا اور کسی دوسری جگہ غیروں کے اندر بیٹھکر بٹالہ پہنچا۔ سٹیشن سے اترا۔ اور رات کے اندھیرے میں قادیان کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ باقی دوستوں نے جب تک سواری کا انتظام کیا یا پیدل چلنے والوں نے قافلہ بندی اور ساتھیوں کو جمع کیا۔ میں کم از کم نصف راہ طے کر آیا ہوں گا۔ اور جوں جوں قادیان کی مقدس بستی قریب ہوتی جاتی میرے جوش اور تیزی میں وفور محبت اور حل مقصود کے باعث اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اللہ کریم نے اپنے فضل سے مجھے غیر معمولی سُرعت سے قادیان دارالامان پہنچا دیا۔ چور یا ڈاکوؤں کا خوف تو خدا کے فضل سے دل میں پیدا نہ ہُوا۔ خیال آتا تو صرف یہ کہ مبادا مجھی کو

بھاگتا ہُوا چور یا ڈاکو

سمجھکر کوئی تعاقب نہ کرنے لگے۔ کیونکہ رات کے اندھیروں میں دوڑنا بھاگنا تو درکنار۔ خالی چلنا بھی اس سڑک پر شبہ کی نظر سے دیکھا جایا کرتا تھا۔

قادیان کی مقدس بستی۔ تخت گاہ رسول اور …. دار الخلافت کے گلی کوچوں میں سے ہوتا ہُوا میں پہلے بورڈنگ مدرسہ احمدیہ کے صحن میں داخل ہُوا۔ جس کے ایک کوارٹر میں ان دنوں حضرت مولانا مولوی محمد سرور شاہ صاحب رہا کرتے تھے۔ دستک دی۔ سلام عرض کیا اور بہت جلد دار السلام پہنچنے کی تاکیدی عرض کے بعد آگے بڑھا۔ محترم بزرگ حضرت عرفانی کبیر شیخ یعقوب علی صاحب تراب جو اس زمانہ میں ابھی اسی نام سے معروف۔ عرفان و سلوک کی منازل طے کر رہے تھے کا دروازہ کھٹکھٹایا پیغام دیا اور پھر آگے کو دوڑنے لگا۔ مکرمی شیخ محمد اسمٰعیل صاحب سرساوی کے مکان پر پہنچا۔ اور اُن کو بھی حضرت نواب صاحب قبلہ کی کوٹھی دار السلام پر پہنچنے کی تاکید کرتا ہُوا آخر

دار السلام پہنچا

جہاں باوجود رات کے دن کا سماں دیکھا۔ بستر خالی اور لوگ نوافل و تہجد میں مصروف پائے۔ کوئی ایک کونے میں پڑا مشغول گریہ و بکا تھا۔ اور کوئی دوسرے میں دست بدعا و التجا۔ کوئی سجدے میں تھا تو کوئی قیام میں۔ کسی کو رکوع میں دیکھا تو کسی کو قعدہ میں۔ کوئی سحری سے فارغ ہو چکے تھے تو کوئی اس کے انتظار و انتظام میں تھے۔ اس نقشہ نے مجھ پر بہت گہرا اثر کیا۔ اور میں گاڑی کے وحشت کدہ کے بعد گویا ایک

حصار امن و عافیت

میں آن پہنچا تھا۔ بڑھا اور اندرون خانہ اطلاع کی۔ سیدنا محمودؓ جو نہ خود ہی بیدار تھے۔ بلکہ اوروں کو بھی بیدار و ہشیار اور دعاؤں کی تاکید فرما رہے بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ عرض حال کیا۔ ساری کیفیت کہہ سنائی۔ اور

وہ ٹریکٹ

پیش کیا۔ حضور نے لیا۔ ورق گردانی فرمائی۔ اور سرسری نظر سے دیکھکر ہی اس کی غرض و غائیت اور مفہوم و مطلب کو پا گئے۔ احباب کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ شوریٰ طلب فرمائی۔ اور اس ٹریکٹ سے پیدا شدہ صورت حالات پر غور و خوض اور مشورہ میں مصروف ہو گئے۔ وہ ایام رمضان کے نہ تھے۔ روزہ نفلی رکھا جا رہا تھا۔ تا استعینوا بالصبر و الصلوٰۃ کی تعمیل کے ذریعہ خدا کی رضا۔ اسی کی مرضی اور سیدھی و مستقیم راہ کے حصول کے لئے خالی الذہن اور صافی القلب۔ جھو اور نفسانیات سے الگ ہو کر دعائیں کی جائیں۔ اور التجائیں کی جائیں۔ اور

خدا سے مدد مانگی

جا سکے۔

سیدنا نور الدین اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی عظیم الشان ہستی فیض مجسم وجود۔ رحمت اور سراسر نور شخصیت سے قوم کا محروم ہو جانا کوئی معمولی نقصان نہ تھا۔ حقیقت شناس اور راز دان عارف تو اسی درد اور سوز سے نہایت درجہ غمزدہ و سوگوار تھے۔ نئے ٹریکٹ سے پیدا شدہ صورت حال نے رنج و غم اور مشکلات میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ پہلی مشکل کا حل۔ درد کا درماں۔ زخم کی مرہم اور چارہ کار تو

سیدنا حضرت محمود ایدہ اللہ الودود

نے اپنی نیکدلی۔ پاک نفسی اور بے لوث و بے غرضانہ حکمت سے پا لیا تھا۔ خاندان کے اراکین اور خواتین مبارکہ کے علاوہ اپنے دوستوں۔ رفیقوں اور ہر طبقہ و درجہ کے لوگوں کو سمجھا بجھا کر۔ وعظ و نصیحت کر کے خطبات دیکر۔ وحدت قومی اور اتحاد کے برکات و فیوض جتا کر۔ اختلاف و شقاق اور تنازع و نفاق کے نتائج و عواقب سے ڈراتے ہُوئے سبھی کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔ مگر اس نئے فتنہ کی افتاد۔ اور تازہ سازش کا انکشاف حضور کے پہلے فیصلہ کے نفاذ اور عملی قدم اٹھانے کی راہ میں ایک سدِ سکندری کی طرح آن حائل ہُوا تھا۔ کیونکہ اس میں سرے سے خلافت کے وجود و قیام۔ نیز ضرورت بیعت ہی سے انکار کر دیا گیا تھا۔ جس کے لئے حضور بہت فکرمند تھے۔ فیصلہ وہی بحال رہا۔ جو رات کے پہلے حصہ میں ہو چکا تھا۔ بلکہ اس ٹریکٹ نے دوستوں کے اس فیصلہ کو اور بھی تقویت پہنچا دی۔

حضور پُرنور نے پہلے کیا فیصلہ کر لیا تھا؟ اور کس امر پر لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا؟ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی مرض میں جب شدت پیدا ہُوئی۔ خطرات بڑھنے لگے۔ تو آئندہ کی فکر اور قومی نظام کے خیال کا پیدا ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جو ہر دل میں آیا۔ اور ہر دماغ سے اٹھا۔ اور ہوتے ہوتے اس کا اتنا چرچا ہُوا۔ کہ جہاں بھی دو چار دوست جمع ہوتے۔ ان کی گفتگو کا مبحث۔ اُن کے خیالات کا مرکز۔ اُن کی فکر کا نقطہ اور تگ و دو کی جولان گاہ۔ یہی

ہونیوالے خلیفہ کا ذکر

ہوتا۔ کوئی دل خالی ہوتا ان خیالات سے نہ دماغ۔ اہالیان قادیان اپنے عرفان و قرب کی وجہ سے ترساں و لرزاں۔ اور لاہور اپنے تصرف و اقتدار کے باعث غالب و نمایاں اور زور شور سے کوشاں تھے۔ اپنے مقاصد اور خیالات کی اشاعت و پروپاگنڈا جدوجہد اور حجت و دلائل دیتے۔ اور یہ وہ ایام ہیں۔ کہ مولانا مولوی صدر الدین صاحب۔ بی۔ اے بی ٹی نے خصوصیت سے خدمات مفوضہ کا حق جس خوبی و خوش اسلوبی سے ادا کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ اس طرح مارچ ۱۹۱۴ء کا نصف اوّل ایک قسم کے خیالی گھمسان اور زبانی جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔

حضرت مولانا مولوی محمد سرور شاہ صاحب خدا تعالےٰ کے فضل سے زندہ و سلامت ہیں۔ اُن کے علم و فضل اور نیکی و تقویٰ اور بزرگی و پاکبازی میں کسی کو کلام نہیں۔ اُن کو اللہ تعالےٰ نے اسباب کی عزت اور جائز شرف بخشا ہے۔ کہ جہاں وہ سیدنا حضرت محمود ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز کے استاد اور علوم ظاہری کے معلم ہیں۔ وہاں "امیر قوم" جناب مولانا مولوی محمد علی صاحب کو بھی پڑھاتے۔ سکھاتے اور درس دیتے رہے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ اُن کے تواتنے گہرے رفیق۔ راز دار و راز داں رہے ہیں۔ کہ اُن کی مجالس کی رونق ہوتے اُن کے خیالات سے واقف اور نہاں در نہاں منصوبوں سے بھی آگاہ رہتے تھے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں۔ اس میں اگر کسی کو کلام ہو۔ شک و شبہ ہو۔ تو میرے بیان کی تصدیق کرے۔ میں نے جو کچھ اوپر لکھا۔ حقیقت پر مبنی ہے۔ اور جو کچھ آگے لکھوں گا۔ وہ بھی سچے واقعات اور حقائق ثابتہ و محکم اور براہین و بینات ہیں۔ اور نہ صرف صاحب ممدوح ہی ان امور کے عینی شاہد اور موقعہ کے گواہ ہیں۔ بلکہ آپ کے علاوہ بھی خدا کے فضل سے ایک بہت بڑی جماعت ابھی تک موجود ہے جو ان واقعات کی صداقت پر غلیظ سے غلیظ قسم اٹھا کر شہادت دینے کو تیار رہے۔ حضرت مولوی صاحب بیان فرماتے ہیں۔ کہ:۔

"ان ایام میں حضرت میاں صاحب یعنی سیدنا محمود منطق پڑھا کرتے تھے۔ اوّل اوّل ہم جنگل کو سیر کی غرض سے باہر نکل جایا کرتے۔ جہاں سبق کی بجائے امر خلافت کا ذکر رہتا۔ میری اپنی رائے یہی تھی۔ اور میرے ساتھ میرے خیال کی موید ایک بڑی جماعت تھی۔ کہ مولوی محمد علی صاحب اور ان کے رفقاء میں سے کسی کی بیعت ہرگز نہ کرنی چاہئیے۔ کیونکہ ایسا کرنے میں خصوصیات سلسلہ مٹ جائیں گی۔ جماعت کا وجود قائم نہ رہ سکے گا۔ اور ہم لوگ اپنا امتیاز کھو کر غیروں میں ملکر نابود و معدوم ہو جائیں گے۔ اور اس طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی وہ غرض و غایت اور مقصد جو ہمیں دوسروں سے الگ اور ممتاز کر کے ایک جماعت قائم کرنے میں پنہاں تھا۔ ہم ضائع کر بیٹھیں گے۔ مگر حضرت صاحبزادہ صاحب میری رائے کے خلاف ہوتے۔ اور فرماتے۔ کہ مولوی صاحب یہ طریق ٹھیک نہیں ہوگا۔ **وحدت قومی** قائم نہ رہ سکے گی۔ اتحاد ٹوٹ جائے گا۔ اور جماعت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ کیونکہ

اُن میں کوئی ایک بھی

ایسا آدمی نہیں۔ جو ہم میں سے کسی کی بیعت کر لے۔ تو دوسرے ساتھی اس کا ساتھ دیں اور سبھی بیعت کر کے ایک ہاتھ پر جمع ہو جائیں۔ برخلاف اس کے مجھے نہ صرف اپنے خاندان پر بلکہ اپنے دوستوں اور سارے ہی ہم خیالوں کے متعلق یقین اور کامل وثوق ہے۔ کہ اگر میں ان میں سے کسی ایک کی بیعت کر لوں۔ تو وہ تمام کے تمام میرا ساتھ دینگے اور بیعت کر کے متحد و یکجان ہو جائیں گے۔ اور اس طرح ہماری قومی وحدت کو جو خطرہ در پیش ہے جاتا رہے گا۔ جماعت بجائے منتشر اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے ایک ہاتھ پر جمع ہو کر متفق و مستحکم ہو جائیگی۔ رہا خصوصیات کا سوال۔ سو اُن میں جب تک خلیفہ کوئی حکم نہ دیگا۔ ہمیں اجازت ہوگی کہ جس چیز کو ہم حق و صداقت یقین کرتے اور منشاء شریعت سمجھتے ہیں۔ قائم کرنے اور اس کے قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ البتہ اگر خلیفہ کبھی حکم دیکر ہمیں روک دے تو اس کا حکم ماننا۔ اور فرمانبرداری کرنا ہمارے لئے ضروری ہوگا۔ اور اس حال میں پھر